بینش فاطمہ

لیکچرار اردو، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

"کئی چاند تھے سر آسماں": تہذیبی شکست وریخت کی روداد

Beenish Fatima,

Lecturer Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science & Technology,

Islamabad.

‘‘Kai Chaand Thay Sar e Aasman’’ :The Narration of the Dilapidation of civilization

Shams ur Rahman Farooqi is an Indian poet and one of the leading Urdu critics and theorists. He is regarded as the T.S. Eliot of Urdu criticism and has formulated fresh models of literary appreciation. Farooqi’s novel is a true character sketch of Urdu-Persian poetry and Indo-Islamic culture. Although the novel has extraordinary qualities and is its own example, but the history and civilization of the age which it is talking about, is now ours. Is of no particular importance. Also, the language used in this novel is no longer commonplace, so it will be largely difficult and incomprehensible. One can clearly see the effects of this cultural breakdown mentioned earlier. And what has been said about language is that of the easy going temperament of our time. In addition to gender differences, it also interferes with the fact that the character that the author has established in the middle of the novel, contrary to the myths, is not the character of a famous and great classical poet. Rather, he is a person of our cultural history who is known to the world as Wazir Khanum alias Chhoti Begum. She has the honor of being the mother of Wazir Khanum Nawab Mirza Dag Dehlavi. As far as the fame and popularity of Dagh Dehlavi is concerned, if you look at it, Wazir Khanum will be called an anonymous woman. This is also a fact because our literary history about Wazir Khanum has been generally silent. Now, in this novel, the way in which the main character is presented and the details of facts and events that have been narrated, even if they are not fully historically confirmed, but they tell a lot about the life and personality of Wazir Khanum. Something can be guessed. At the same time in the light of the personality of Wazir Khanum of this eraIf a list of the best Urdu novels is compiled, Shams-ur-Rehman Farooqi's "Kai Chand The Sar Aasman" will surely be counted among the first ten novels.

شمس الرحمان فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" اکیسویں صدی کا ایک بڑا ناول ہے جس کا اعتراف اردو ادب کے تمام لکھاریوں نے کیا ہے۔ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے غلام باغ کی طرح جس میں بدلتے ہوئے واقعات ناول کی وسعت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ناول میں تاریخ، سیرت نگاری، تہذیب اور خاص کر اسلامی تہذیب کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا اسلوب بھی منفرد طرز کا ہے زباں وبیاں کے اعتبار سے ناول کو اردو ناول کے بڑے ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کئی چاند تھے سر آسماں میں داستان کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی قصہ سنایا جا رہا ہو۔ کہانی کی بنت تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامائی سی ہے ماضی اور حال کو جوڑ کر ڈرامائی پن پیدا کیا گیا ہے جس کے ساتھ ساتھ سسپنس کا عنصر ناول میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوار اور دوسرے افسانے" منظر عام پر آیا تو اس کی بھی غیر معمولی شہرت اور پذیرائی ہوئی، ساتھ ہی ادبی دنیا میں اس بات کا چرچا بھی دیر تک ہوتا رہا کہ ان افسانوں کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی ہے اور اس کا جو نقشہ سامنے آیا ہے، اس کی کوئی مثال اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتی یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ان افسانوں میں اردو کے مشاہیر شعرا مثلاً میر تقی میر، مرزا غالب اور غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کو مرکز میں رکھ کر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی صورت حال کو ایسی غیر معمولی مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے اس انقطاع کے اثرات کو ختم کر کے اپنی قدیم ادبی و تہذیبی روایت سے رشتہ قائم اور مستحکم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ کلاسیکی تہذیب اور شعریات کے حوالے سے خدائے سخن میر تقی میر پر عہد ساز کتاب۔"شعر شور انگیز" ہو یا مذکورہ افسانے ہوں، سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اب جب کہ یہ ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" اشاعت پذیر ہوا ہے تو اسے بھی شمس الرحمن فارقی کے اس بڑے منصوبے کا اہم حصہ سمجھنا چاہیے، جس کے تحت وہ گزشتہ کئی برسوں سے اپنی قدیم روایت کی بازیافت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک معنی میں دیکھا جائے تو فاروقی کے مذکورہ بالا افسانوں کو اس ناول کی تمہید یا نقش اول بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ موضوع، طرز بیان اور زبان کی نوعیت کے اعتبار سے ان افسانوں اور ناول میں بڑی یکسانیت نظر آئی ہے۔ البتہ افسانوں میں اختصار کے سبب جو کچھ، محض اشاروں میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے، اسے ناول میں بہت پھیلا کر جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

افسانوں کے بر خلاف ناول کے مرکز میں مصنف نے جس کردار کو قائم کیا ہے، وہ کسی مشہور اور بڑے کلاسیکی شاعر کا کردار نہیں، بلکہ ہماری تہذیبی تاریخ کی ایسی شخصیت ہے جسے دنیا وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کے نام سے جانتے ہیں۔ انھیں وزیر خانم کو نواب مرزا داغ دہلوی کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ داغ دہلوی کو جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے سامنے دیکھا جائے تو وزیر خانم گمنام خاتون ہی کہی جائیں گی۔ یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ وزیر خانم کے بارے میں ہماری ادبی تاریخ عام طور سے خاموش رہی ہے۔ اب اس ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت سے جس طرح پیش کیا گیا ہے اور حقائق واقعات کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہ تاریخی طور پر خواہ پوری طرح مصدقہ نہ ہوں لیکن ان سے وزیر خانم کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ وزیر خانم کی شخصیت کی روشنی میں اس کے ذہن اور مزاج ومذاق کو بھی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اس ناول سے ایک ویژن بر آمد کیا ہے۔ اس ویژن کا تعلق اس ٹریجڈی یا المیے سے ہے جس سے وزیر خانم چار شادیوں کے دوران گزری۔ چنانچہ ان کے نزدیک ناول کا عنوان وزیر خانم کا عظیم المیہ" ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ناول کا عنوان بے حد خوبصورت ہے جو کہ احمد مشتاق کے ایک خوبصورت شعر کا مصرع اولیٰ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ناول کا پورا قصہ نہ صرف وزیر خانم کے المیہ بلکہ اس پورے عہد کے مجموعی المیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ناول میں ڈرامہ کا عنصر اور بالخصوص المیہ کا پہلو بہت واضح ملتا ہے۔ ناول کی کہانی وزیر خانم کے کردار کے گرد گھومتی ہے اور اس کی زندگی کے نشیب وفراز کو بیاں کرتی ہے وہ بیچاری جس نے چار شادیاں کی مگر کوئی بھی شادی کامیاب نہ رہی۔ ہر بار ہی کوئی ان ہونی ہونے کے سبب اس کے مجازی خدا خالق حقیقی سے جا ملے اور وزیر خانم دنیا میں اکیلی رہ گئی انیسویں صدی کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول اپنے مرکزی کردار کی بدولت جدید لگتا ہے۔ کیونکہ ایک ایسا معاشرہ جہاں عورت کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہیں پر وزیر خانم حکمرانی کرتی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نظریات اور بیباک پن اکیسویں صدی کی برصغیر کی خاتوں سے بھی کہیں زیادہ ہے وزیر خانم کے نظریات کی بات سے پہلے اس کے سراپے کا احوال جان لیتے ہیں جو کہ شمس الرحمان فاروقی نے ان الفاظ میں بیاں کیا ہے۔

"کسی انتہائی خوب صوت لڑکی کی تصویر تھی اس کی عمر یہی چوبیس چھبیس سال کی رہی ہوگی سانولا رنگ لیکن اس قدر تر و تازہ چہرہ گویا کسی نے سوسن کے پھول کا جوہر نچوڑ کر رکھ دیا ہو، سیدھی، نازک سی

ناک لیکن دونوں نتھنے پھڑکتے سے، جیسے اس نے کوئی اچھی بات سنی ہو یا کوئی اچھی بات کہنے والی ہو، کوئی ڈیڑھ سو برس پرانی تصویر دو چشمی تھی لیکن اس زمانے کی عام تصویروں کے بر خلاف صاحب تصویر کو یوں دکھایا گیا تھا گویا مصور اور تماشائی، دونوں کے وجود کا پورا احساس رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ میرا دل وہ زور زور سے ڈھڑکنے لگا لگتا تھا کہ یہ تصویر اپنی آنکھ یا ابرو سے مجھے کوئی اشارہ کرنے والی ہے"(۱)

ناول کے تمام کردار تاریخی ہیں اور اپنے اصل ناموں کے ساتھ مخصوص تاریخوں میں انھیں مخصوص مقامات پر اپنے اپنے علم وہنر کے اعتبار سے اپنے تکنیکی لفظوں سے ترتیب دی ہوئی اسی زمانے کی زبان بولتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار "وزیر خانم" مغلیہ سلطنت کے ٹوٹتے ہوئے اقتدار کی علامت کے طور پر اور "ولیم فریزر" انگریزی حکومت کے جبر اور اقتدار کی علامت کے طور پر لائے گئے ہیں۔ لیکن اس کے بقیہ سبھی کردار علامتی نہیں ہیں۔ اس ناول میں کہیں کہیں داستانی رنگ بھی نمایاں ہے۔ مکالمے انتہائی جاندار اور دلکش ہیں۔ منظر نگاری ایسی ہے کہ جیسے کوئی آرٹ فلم نظروں کے سامنے چل رہی ہو یعنی پورا عہد زندہ کر دیا گیا ہے۔ ناول کے فن اور اس کی اب تک کی تاریخ کو دھیان میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فارقی صاحب نے تکنیک کا ایسا استعمال کیا ہے کہ یہ "مرقع" جدید نظر آئے۔ مثلاً پہلے باب کی سرخی یوں دی گئی ہے:

وزیر خانم (ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم کی یادداشتوں سے)

اور پھر یہ سلسلہ سلیم جعفر، شمیم جعفر اور وسیم جعفر تک آتا ہے۔ گو کہ یہ صحافیانہ سی غیر ضروری تفصیلات ہیں لیکن جیسے ہی اس میں ان دستاویزات کا تذکرہ ہوا جو وسیم جعفر نے مرنے سے پہلے خلیل اصغر فاروقی کو فراہم کر دی تھیں تاکہ وزیر خانم کے بارے میں تحقیق کی جاسکے تو قصے میں جان پڑ جاتی ہے۔ وسیم جعفر اس ماہ لقا کی تصویر مرزا فخرو کے روز ناچے سے پہلے ہی نکال چکے تھے تاکہ برٹش لائبریرین کو پتا نہ چل سکے۔ خلیل اصغر فاروقی اور وسیم جعفر کی گفتگو کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے اور خاص دلچسپی ہے۔

اس ناول کو تمام ناولوں سے مختلف و منفرد بنانے والی چیز اس کی نہایت عمدہ زبان ہے۔ اس ناول کی زبان ایسی ہے کہ ابتداء سے اب تک کسی ناول نگار نے استعمال نہیں کی۔ یہ زبان آج کی زبان نہیں بلکہ اس

زمانے کی ہے جس وقت کے یہ واقعات ہیں۔اس ناول کی زبان، زماں کے ساتھ چلتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے کچھ پرانے الفاظ متروک ہوتے جاتے ہیں اور نئے الفاظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوتی، اس لیے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ناول کی زبان کب تبدیل ہوگئی۔ یہی نہیں، مکان کی تبدیلی سے اس نئی جگہ اور اس زمانے کے الفاظ تحقیق کر کے استعمال کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف کرداروں کے علم وہنر کے اعتبار سے بھی تکنیکی الفاظ تلاش کر لیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کردار اگر مکان بدلتا ہے تو دوسری نئی جگہ پر ائوڈالتا ہے تو وہاں کے الفاظ اور اس کے اپنے الفاظ پہلے ملے جلے اور بعد میں نئی جگہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔سید ارشاد حیدر اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

۸۳۰ "صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول میں ہزاروں الفاظ کی تحقیق کر کے نئی زبان بنا کر اسے تخلیقی زبان میں منتقل کیا گیا ہے اور پورا ناول اسی زبان میں تخلیق کیا گیا ہے۔۔۔ناول کی زبان با محاورہ اور رواں ہے لیکن بار بار لغت دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو کہ لغت میں بھی نہیں ملتے۔۔۔ اغلب کہ یہ الفاظ اس مخصوص طبقے کی عام بول چال کے رہے ہوں گے۔۔۔ بہر حال یہ تو طے ہے کہ الفاظ کی عمیق تحقیق کے بعد ان سے ایک نئی زبان بنانا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔"(2)

یہ بات تو مبنی پر حقیت ہے کہ اس ناول کی زبان آج کی زبان نہیں ہے، بلکہ اسے ماضی قریب کی زبان بھی نہیں کہہ سکتے۔اس اعتبار سے ناول میں مستعمل زبان کا وافر حصہ موجود قاری کے لیے نامانوس ضرور ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہہے کہ نامانوس زبان کا یہ استعمال ناول کی خامی یا ناکامی پر معمول نہیں ہو سکتا بلکہ ایسے ناول کا تقاضا اور اس طرح کی بہت بڑی قوت کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مصنف نے ناول میں بیانیہ کی جو حکمت علمی اختیار کی ہے، اس کی رو سے زبان کا بڑا حصہ وہ ہو ہی نہیں سکتا جسے ہم آج استعمال کرتے ہیں۔ یہاں بیانیہ کو اس طرح بروئے کار لایا گیا ہے کہ پورا ناول ایک سے زیادہ زاویوں کے ذریعے بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، ناول کا بڑا حصہ وزیر خانم کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔وزیر خانم کے والد محمد یوسف سادہ کار ناول کے پانچویں باب بعنوان ''تصویر'' کے آغاز سے بطور حاضر راوی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ سنہ عیسوی 1840 ہے اور اس وقت ان کی عمر 47 سال ہے۔ یہاں سے یوسف سادہ کار کا بیان ناول کے بیسویں باب تک جاری مارسٹن بلیک سے منسلک ہو کر جے پور چلی جاتی ہیں اس کے بعد Assistant Political Agent رہتا ہے۔ جب وزیر خانم کے واقعات غائب راوی کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔ بطور حاضر راوی یوسف سادہ کار اپنی سب سے چھوٹی بیٹی وزیر خانم کر ذکر سے پہلے اپنے خاندان اور اجداد کا حال بھی نہایت

تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ تفصیلات نہایت دلچسپ اور حد درجہ لائق توجہ ہیں۔ ان کے بیان میں مصنف کی تخلیق مہارت کا جو اظہار ہوا ہے، وہ قابل داد ہے۔ یوسف سادہ کار کی خاندانی تفصیلات کے بیان کا جو از بھی ناول کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔

محمد یوسف سادہ کار کی زبانی ناول میں مذکورہ ہونہ ہیں۔ چونکہ یہ زمانہ وسط انیسویں صدی کا ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں روای بھی اسی زمانے کا ہے، لہذا یہ لازمی تھا کہ اس کے ذریعے جو کچھ بیان ہو، وہ اسی عہد کی زبان میں ہو۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا تقاضا ہی یہ تھا کہ اس میں زبان وہ استعمال ہو جو آج نہیں بلکہ انیسویں صدی میں یا اس سے پہلے مستعمل تھی۔ اس عہد کے ہندوستان بالخصوص دہلی کی ادبی و تہذیبی فضا پر زبان و بیان کا جو رنگ چھایا ہوا تھا اسے ہم اج اس ناول کے ذریعے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ ناول کے ابتدائی چار ابواب کا بیانیہ بھی خاص طور سے توجہ کے لائق ہے دراصل ان ابواب میں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک اور ان سے متولد اولادوں اور ان کے اخلاف کا بیان ہے۔ مارسٹن بلیک اور وزیر خانم سے دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹی سوفیہ عرف بادشاہ بیگم اور ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا۔ مارسٹن بلیک کی موت کے بعد وزیر خانم اپنی اولادوں سے محروم ہو گئیں اور یہ دونوں بچے مارسٹن بلیک ہی کے خاندان میں پلے بڑھے پھر انگلستان جا کر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان ابواب میں ان کی اولادوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ناول کے ایک کردار وسیم جعفر انھیں اولادوں میں سے ایک ہیں۔ ان تفصیلات کا بیان بھی حاضر راوی کے ذریعے ہوا ہے۔ لیکن یہاں حاضر راوی کوئی حقیقی کردار نہیں بلکہ ایک فرضی کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مصنف نے اس فرضی کردار کی تشکیل بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے۔ چنانچہ ناول کے پہلے باب بعنوان "وزیر خانم" کے آغاز سے پہلے قوسینمیں لکھا گیا ہے "ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم کی یادداشتوں سے۔" یہی فقرہ دوسرے اور تیسرے باب کے آغاز میں بھی درج ہے اور چوتھے باب کے شروع میں "ڈاکٹر وسیم جعفر کی تحریرات پر مبنی" لکھا ہوا ہے۔ ان ابواب میں بیان کردہ تفصیلات چونکہ تاریخی طور پر پوری طرح مصدقہ نہیں ہیں، اس معنی میں حقیقی ہے کہ ان کا تعلق وزیر خانم کی اولادوں امیر مرزا اور بادشاہ بیگم کے خاندان سے ہے۔ البتہ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی سے موسوم حاضر راوی قطعاً فرضی ہے۔ اس راوی کی تشکیل میں مصنف نے جدت طبع کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ راوی کے فرضی نام میں بھی ایک دلچسپ پہلو پنہاں ہے شمس الرحمن فاروقی کے والد کا نام مولوی محمد خلیل الرحمن فاروقی اور دادا کا نام حکیم مولوی محمد اصغر فاروقی ہے۔ اس طرح مصنف نے اپنے والد اور جد بزرگوار کے ناموں کو ملا کر فرضی نام کی تشکیل اس خوبصورتی سے کی ہے کہ یہ نام فرضی معلوم ہی نہیں ہوتا۔ چو

نکہ ان ابواب کے آغاز میں ہی کہہ دیا گیا ہے کہ آگے جو کچھ بیان ہو گا اس کے بنیاد محض یادداشتوں پر ہے، لہذا اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر یہاں کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی تفصیل مبنی بر حقیقت نہ ٹھہرے یا تاریخی اعتبار سے غلط قرار پائے تو اس میں کوئی قباحت نہ ہو گی یا اسے قابل گرفت نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ اصلاً اور اولاً یہ سارا بیان ہے تو ناول کا حصہ، کسی تاریخ کی کتاب کا جذو نہیں۔ علاوہ ازیں پہلے باب کا اولین اقتباس ہی ان باتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ ''وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم (پیدائش غالباً 1811) محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ لیکن محمد یوسف سادہ کار دہلوی الاصل نہ تھے، کشمیری تھے۔ یہ لوگ دہلی کب اور کیونکر پہنچے، اور دہلی میں ان پر کیا گزری، یہ داستان لمبی ہے۔ اس کی تفصیلات پہلے بھی کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ حسب ذیل ہے، لیکن ضروری نہیں کہ یہ سب تاریخی طور پر بالکل درست ہو۔'' اس اقتباس کا آخری فقرہ نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی یہ اس بات کا واضح اشارہ اور اعلان ہے کہ اگے جو بھی واقعات بیان ہوں گے وہ اگرچہ غیر تاریخی تو نہ ہوں گے لیکن وہ سب ایسے بھی نہ ہوں گے جنھیں تاریخی طور پر بالکل درست سمجھا جانا ضروری ہو۔ اس بیان سے اس بات کا جواز مزید مستحکم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ فکشن ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی اور قوت اس کے زبان وبیان اور جزئیات نگاری میں پوشیدہ ہے۔ ایک خاص عہد کی زبان کو دوبارہ زندہ کر کے اس طرح استعمال کرنا کہ واقعات بھی پوری طرح متشکل ہو جائیں اور بیانیہ کے اصول بھی مجروح نہ ہوں، نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس زبان کے روزمرہ اور محاورے کی خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے اور اداب گفتگو وغیرہ کے تمام لوازم کا پورا پورا پاس ولحاظ بھی قائم رہے۔ ان تمام باتوں کے لیے مطالعہ ومشاہدہ اور مشق کی جس منزل تک رسائی درکار ہوتی ہے، فاروقی صاحب نہ صرف وہاں تک پہنچے ہیں بلکہ اس پر ان کا بھرپور تصرف بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں مستعمل زبان کے سلسلے میں انھوں نے کتاب کے آخر میں خود لکھا ہے کہ ''میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مکالموں میں، اور اگر بیانیہ کسی قدیم کردار کی زبانی، یا کسی قدیم کردار کے نقطہ نظر سے بیان کیا جارہا ہے تو بیانیہ میں بھی، کوئی ایسا لفظ نہ آئے پائے جو اس زمانے مستعمل نہ تھا۔'' اس کے بعد وہ اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں ''ظاہر ہے کہ یہ بات لغات کی مدد کے بغیر نہ تھی۔'' دراصل یہ بیان اعتراف سے زیادہ انکسار مزاج کا اظہار معلوم ہوتا ہے لغات کی کتابیں تو ہمیشہ سب کے لیے موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں مندرج الفاظ کے خزانے کو کامیابی کے ساتھ وہی صرف میں لاتا ہے، جس کے مزاج میں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔ اردو فارسی کی قدیم کلاسیکی روایت اور تہذیب سے فاروقی صاحب کے مزاج کی مناسبت کمال ہے۔ اس کا اظہار ان کی تحریر و

تقدیر سے عموماً ہوتا رہتا ہے۔ لہذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ انھوں نے ایک خاص عہد میں مروج الفاظ ومحاورات کی تلاش میں لغات سے مدد ضرور لی ہے لیکن انھیں بیانیہ کا جزو بنانے کا اہم ترین اور مشکل ترین مرحلہ ان کے افتادِ طبع اور غیر معمولی قوت بیان ہی کے ذریعے سر ہوا ہے۔ قدیم عہد میں الفاظ کے مخصوص معنوں میں استعمال کی ایک مثال یہاں کے لیے مخصوص مہمان خانے میں قیام پذیر ہیں۔ رات کا وقت ہے نواب صاحب جب مہمان خانے میں داخل ہوتے ہیں تو کہتے ہیں "شب بخیر، وزیر خانم "یہاں "شب بخیر" کا فقرہ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن معنوں میں آج یہ مروج ہے۔ چنانچہ حاشیے میں یہ وضاحت درج ہے " پرانے زمانے میں شام یا رات کو ملاقات کے وقت "شب بخیر" کہتے تھے، گویا کا مرادف تھا۔ آج یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب رات کے لیے رخصت ہو رہے ہوں، یعنی اب Good Evening یہ انگریزی کا مرادف ہو گیا ہے۔ یہاں اہم بات صرف یہ نہیں ہے کہ "شب بخیر" کے فقرے کو مصنف نے قدیم Good Night یہ فقرہ معنی میں استعمال کیا ہے جس میں دلچسپ پہلو یہ بھی پنہاں ہے کہ اس فقرے کے موجودہ اور قدیم معنی ایک دوسرے کے متضاد ہیں، جیسا کہ حاشیے کی درج بالا عبارت سے ظاہر ہے، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ فقرہ موقع اور محل سے بھی گہری مناسبت رکھتا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار سننے سنانے کا عام رواج تھا۔ اسے آداب محفل اور طرز گفتگو وغیرہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ موقع محل کے لحاظ سے دلچسپ اور اعلیٰ درجے کے شعر سنانا شخصیت کی خوبی اور بڑائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور جواب میں بر محل شعر پڑھ دینا مزید خوبی کی بات تھی۔ ناول میں یہ پہلو جس خوبصورتی اور چابک دستی کے ساتھ نمایاں ہوا ہے، اس کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہو گی۔ مصنف نے کمال ہنر مندی کے ساتھ اشعار کو جابجا عبارتوں اور مکالموں میں اس طرح کھپایا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ اشعار انھیں موقعوں کے لیے کہے گئے تھے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ بیان کے دوران ان اشعار کو الگ سے لا کر رکھا گیا ہے۔ یہاں بھی فاروقی صاحب کے مطالعے کی وسعت، اردو فارسی کی شعری روایت پر گہری نظر اور ان کا عالمی استحضار پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جہاں جہاں فارسی اشعار لائے گئے ہیں وہاں ان کا اردو ترجمہ درج نہیں گیا گیا ہے۔

ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاری کی دلچسپی لگاتار برقرار رہے اور یہ تجسس رہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ابتدائی پچاس۔ ساٹھ صفحات میں مصنف نے وزیر بیگم کے اسلاف کا شجرہ بیان کیا ہے جس میں ان کی زندگی کے مختصر حالات ہیں، جو ناول کی اصل کہانی سے کم دلچسپ نہیں۔ شجرہ وزیر خانم کے دادا کے باپ میاں عرف مخصوص اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ میاں مخصوص اللہ کشن گڑھ کے شہبہ ساز تھے جنھوں نے

ایک ایسی تصویر بنائی جس کی شبیہہ والی جاہ گجندر پتی مرزا عرف مہرا اول کی چھوٹی بیٹی من موہنی (یا سترھویں صدی کے ایک والی کشن گڑھ کی محبوب ملکہ کی بنی ٹھنی کی تصویر یا کشن گڑھ کی رادھا) کی شبیہہ جیسی تھی۔ اے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ ستر پردوں میں رکھی جاتی تھی۔ میاں نے اس کی تصویر کیسے بنائی اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مہار اول جب یہ تصویر دیکھتا ہے کہ من موہنی بے چادر و جوتی، ناک، ہاتھ، پائوں زیور سے عاری اور پائوں میں بیڑی کے ساتھ بے پردہ مجافے میں ہے تو اس واقعے کو مصنف نے کس دلچسپ انداز میں انجام تک پہنچایا۔ وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

"من موہنی میری طرف دیکھ تو میری بیٹی، میں والا جاہ گجندر پتی مرزا تیرا باپ، میں نے تجھے اس لیے تو پیدا نہ کیا تھا کہ تو مجھے رسوا کرے۔ یہ تیری تصویر یہاں سے آئی؟ کس نے تجھے دیکھا اور کس نے اسے اتنی جرات بخشی کہ وہ تیری شبیہہ کو میرے پہلو میں زخم دامن دار بنادے اور پھر تیرے نام کو لوگ یوں اچھالیں کہ وہ زمین آسمان میں شہاب ثاقب کی طرح سب کے لیے مفت نظر بن جائے؟۔۔"(3)

من موہنی خاموش رہی اور چند ہی ثانیوں میں اس کے باپ نے اس کی گردن اڑادی کیونکہ اس کی تصویر نے اس کے باپ کی عزت کو خاک میں ملادیا تھا۔ اور اس تصویر کو گھوڑے کے سموں تلے پامال کر دیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ میاں نے موہنی کو اصل میں دیکھا تھا یا یہ محض اس کا تخیل تھی لیکن وہ اس پامال تصویر کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور ہمیشہ گم سم رہتا تھا۔ مرتے وقت یہ تصویر اس کے پاس سے بر آمد ہوئی۔ میاں نے کشمیر کی جانب ہجرت کی، وہیں شادی کی اور پھر ان کی اولاد کشمیر سے فرخ آباد (ہندوستان) کی طرف آگئی۔ ہ تصویر ناول میں بار بار آتی ہے۔ یہاں تک کہ میاں کی چوتھی نسل میں محمد یوسف سادہ کار کی تیسری بیٹی وزیر خانم (۱۸۱۱ئ) پیدا ہوتی ہے جو ہو بہو من موہنی کی شبیہہ ہے۔ لیکن یہ من موہنی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ انگریزوں کے زمانے کی بالکل آزاد خیال، خود مختار اور اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کرنے والی خاتون ہے جو ایک انگریز مارسٹن بلیک سے بغیر نکاح کے منسلک ہو جاتی ہے اور ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے۔

شادی کے بارے میں اس کے زریں خیالات ملاحظہ کیجئے وہ اس زمانے کے اعتبار سے اس امر پر راضی نظر آتی ہے یہ تعلق وہ اچھا جسے توڑا جاسکے۔ اسے اپنے آپ اور تقدیر پر اتنا بھروسا ہے کہ کہتی ہے کہ شاہزادہ اگر نصیب میں ہے تو ضرور آئے گا۔ ورنہ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی، پسند آئے گا تو رکھوں گی نہیں تو نکال باہر کروں گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بھی زیادہ عمر کی نہیں تھی اور زندگی کے میدان میں عقل، ذہانت اور فطانت کے جو بڑے قد و قامت کے گھوڑے دوڑا رہی تھی ان کی گرد کو شاید پچاسی نوے برس

کی خاتون بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔مارسٹن بلیک کے مارے جانے کے بعد اس کے دونوں بچے بلیک کی بہن نے چھین لیے اور ظاہر ہے کہ وہ عیسائی بنا دیے گئے۔ایک ماں سے اس کے بچے چھین لیے جائیں کیا یہ کسی المیے سے کم ہے؟ پھر جائیداد کا حقدار نہ ہونا۔دوسرا المیہ یہ تھا کہ شادی نہ ہوئی تھی اگر ہوئی ہوتی اور رجسٹر ہو جاتی تو بلیک کی جائیداد سے اسے بڑا حصہ ملتا۔وہ اکیلی دہلی میں رہنے لگی اور اپنے ماضی کو یاد کرتی رہتی اور مرد کے راج کو کوستی رہتی۔ناول سے اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھیے:

"اس دنیا میں مرد ہی ہیں انہیں کا راج ہے انھیں کا راج۔ہم لوگوں کو تو بس ہے کہ انھیں جہاں تک ہو سکے اپنی مٹھی میں کیے رکھیں۔۔۔اور پھر میرے بچوں، میرے جگر بند امیر مرزا(بیٹا) اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک(بادشاہ بیگم) کا کیا ہو گا؟"(5)

لیکن بے مائیگی، مایوسی اور اداسی کا یہ عرصہ طویل نہیں تھا۔وہ نواب شمس الدین حمد سے منسلک ہو گئی اسی وقت ولیم فریزر کی نظر بھی وزیر خانم پر تھی لیکن اسے ناکام ہونا پڑا۔نتیجے کے طور پر اس نے شمس الدین کو نیچا دکھانا اور وزیر خانم کی توہین کرنا شروع کر دی۔عاجز آکر شمس الدین اپنے آدمی کریم خاں سے فریزر کا قتل کرا دیتے ہیں۔لیکن وہ بالا آخر تفتیش میں پکڑے گئے اور انھیں پھانسی کی سزا ہو گئی۔وزیر خانم کے شمس الدین سے ایک بیٹا پیدا ہوا نواب مرزا جو بڑا ہو کر داغ دہلوی کے نام سے مشہور ہوا۔اس کے بعد وزیر خانم تیسرے مرد آغا مرزا تراب علی کے نکاح میں آجاتی ہے۔مرزا تراب علی کا بھی ٹھگوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ٹھگی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور سیاسی تاریخ میں بھی انگریزوں کا اس خوفناک اور دردناک نظام کے خلاف ایکشن موجود ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ٹھگوں کی آغا مرزا تراب علی کے خلاف واردات کی جس انداز سے عکاسی کی ہے اسے لرزہ خیز قرار دیا جا سکتا ہے۔آغا مرزا تراب علی کی تلاش میں جب قبر کشائی کی گئی تو اس کا بیانیہ بہت دردناک ہے۔

"اوپر تلے آٹھ قریب قریب ننگی لاشیں، باہری کپڑوں سے مبرا سب سے نیچے آغا مرزا تراب علی کی لاش تھی۔دوران خون اور سلسلہ تنفس بند ہو جانے کے باعث سب کے بدن پہلے تو اکڑ گئے تھے اور پھر چوبیس گھنٹے یا اس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد دوبارہ نرم پڑ گئے تھے، لیکن اکڑن کے زمانے میں جگہ کی تنگی کے باعث سب لاشیں کچھ نہ کچھ شکستہ اور مسخ شدہ ہو گئی تھی، بعض کے جبڑے ٹیڑھے ہو کر پھر سیدھے نہ ہوئے تھے۔بعض کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔(6)

شمس الرا حمٰن فاروقی نے دستاویزی رجحان کے تحت ان کے خاندان، ان کے تربیتی نظام، ان کے شادی بیاہ کی روایات اور رسوم کا حال بیان کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ ایک طویل عرصے سے چلے آرہے ظالمانہ پیشے سے متعلق تھے جہاں ندامت کو کوئی گزر نہ تھا۔ بہر حال مرزا تراب علی مارے جاتے ہیں اور وزیر خانم پھر بے سہارا ہو جاتی ہے اور چوتھے مرد مرزا فخرولی عہد (مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا غلام فخر الدین) کی بیوی بن کر قلعے میں "شوکت محل" کا خطاب پاتی ہیں۔ لیکن مرزا فخرو کی فطری موت (۱۸۵۶ئ) ہو جاتی ہے اور وزیر خانم قلعے سے بے دخل کر دی جاتی ہیں۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے بے سہارا ہو جاتی ہیں۔ چاروں شہروں سے انہیں ترکہ میں کچھ نہیں ملا اور دہلی سے رام پور (جہاں ان کی منجھلی بہن تھیں) کا سفر کرتی ہیں۔ ناول یہاں ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔

ناول میں شروع سے آخر تک ایک تجسس اور تسلسل بر قرار رہتا ہے۔ فرضی کرداروں کے مزاج اور خط وخال واضع کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ تاریخی کرداروں کے مزاج اور خط وخال بیان کرنا۔ مصنف نے کردار سازی میں ایک مصور جیسا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے لفظوں کے ذریعے وہ مصوری کی ہے کہ کردار کے مزاج، خط وخال، لباس اور ان کی زبان، ان کی جسمانی حرکات وغیرہ اس قدر واضح ہو گئے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہوں۔ جبکہ مصنف کے سامنے محض رونما ہونے والے یا تصور میں لائے گئے واقعات ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں کردار کا مزاج، اس کی زبان، اس کا لہجہ، اس کی آرائش کیسی ہو گی، اس تصور کو سامنے رکھ کر ایک مصوری کی طرح تصویر بنائی گئی ہے۔ مصور بھی صرف تصویر بناتا ہے لیکن مصنف نے تو کہیں کہیں تصویر کو جاندار انسان بنا دیا ہے۔ 'بنی ٹھنی' کی تصویر کی اتنی عمدہ عکاسی کی ہے کہ وہ زندہ عورت لگتی ہے:

"کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلوے سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک تھی کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت، ہیرے، گومید اور تامڑے صاف جھلکتے تھے۔ کھلا ہوا گندمی رنگ، منہ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق اور مصور اس قدر مشتاق تھا کہ مسکراہٹ کی وجہ سے کانوں کی لوئوں کی سرخی اور خفیف سا کھچاؤ تک دکھائی دیتا تھا بلکہ محسوس ہوتا تھا۔۔ ۔اس وقت تو یہ لگتا تھا کہ کوئی پری شہزادی دل کے سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی دنیا کی تمام حسینوں پر راج کر رہی ہے۔ پوری شبیہ پر ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت تھی گویا پری اپنی مرضی سے آئینے میں اتر آئی ہو اور آئینہ اسے آغوش میں لے کر سو گیا ہو۔"(7)

مصنف نے تمام کرداروں کو ان کے مقام و مرتبہ اور شخصی خصوصیت کے پورے التزام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وزیر خانم کو ناول میں چار اشخاص کے ساتھ یکے بعد دیگرے وابستہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں مارسٹن بلیک اور نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ وہ بغیر نکاح وابستہ رہیں اور آغا مرزا تراب علی اور مرزا فخرو و بہادر ولی عہد سوئم سے ان کا مناکحت کا رشتہ رہا۔ ان چاروں افراد کے بیان اور ان کے کردار کی خصوصیات کی تفصیل میں مصنف نے کمال ہنر مندی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں مارسٹن بلیک اور نواب شمس الدین احمد سے وزیر خانم کی وابستگی کے زمانے کو خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ اول تو وزیر خانم نے ان کے ساتھ نسبتاً زیادہ طویل عرصہ گزارا، دوسرے یہ کہ ان رشتوں کی تہہ میں فریقین کی طرف سے جذباتی شدت اور دل کے معاملے کو بھی خاصا دخل تھا۔ یہ ناول اوپری سطح پر محبت کی ایسی داستان ہے جس میں کامیابی اور ناکامی و محرومی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن اس کی تہ میں ایسی حقیقتیں بھی پوشیدہ ہیں جو انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخی، سیاسی اور تہذیبی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں کا رویہ تھا اور انگریز حکام اپنی طاقت کو روز بروز مزید مستحکم کرنے کے لیے کیا کیا حکمت عملی اختیار کر رہے تھے، اس کی طرف بھی بہت سے اشارے ناول میں موجود ہیں ولیم فریزر کا قتل ناول کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان خاص کر دہلی کی معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا اندازہ بھی ناول سے ہوتا ہے۔ مختلف علوم و فنون کا بیان ان کی مکمل تفصیلات اور تمام باریکیوں کے ساتھ ناول کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس ناول کے تمام کرداروں کے مزاج اور خط و اخال کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن مصنف نے وزیر خانم کے کردار پر اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ ناول کا مرکزی کردار ہے اور اس لیے بھی کہ یہ کردار مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کی علامت کے طور پر لایا گیا ہے جس پر انگریزوں نے اپنے پنجے گاڑھنے شروع کر دیے ہیں۔ وزیر خانم کے کردار کا بیان اس لیے بھی مشکل ہے کہ وہ ہند اسلامی تہذیب کی علامت بھی ہے جو انگریزوں کی چمک دمک سے متاثر ہے۔ اسی لیے وہ اکثر کشمکش میں بھی مبتلا رہتی ہے لیکن اس کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ خود ہی سوال کرتی ہے، خود ہی اس کا جواب تلاش کرتی ہے اور خود ہی اپنے آخری فیصلے پر پہنچتی ہے۔ اسی کردار کی آرائش میں مصنف نے اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے ایسا کہ یہ کردار ناول کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تاریخ میں بھی جہاں اس کے نقوش دھندلے تھے، انھیں اجاگر کر دیا ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد اب وزیر خانم ایک

غیر معمولی خاتون ہے جو ادبی ذوق بھی رکھتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اسے اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار یاد ہیں بلکہ وہ خود بھی شعر کہتی ہے۔ مصنف کے مطابق اگر وہ محنت کرتی اور دل لگا کر کہتی تو شعر گوئی میں ماہ لقابائی چندا سے کم فرونہ ہوتی۔ مصنف نے اس کا نام-'زہرہ' تحریر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زہرہ نامی ایک شاعرہ اس زمانے میں تھی اور وہ شاہ نصیر کی شاگردہ بھی تھی۔ جیسا کہ ناول کی کردار وزیر خانم المتخلص بہ زہرہ کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے۔ مصنف نے دو تاریخی کرداروں کو ایک کر دیا ہے۔ گفتگو میں جبھی اشعار کا جواب اشعار ہی سے دیتی ہے، مصنف نے وزیر خانم کا سراپا ناول میں کئی جگہ مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ تین صفحات میں یہ سراپا بیان ہوا ہے جس میں خط وخال تو دور کی بات ہے کپڑوں کی شکنیں تک نظر آتی ہیں:

"وزیر خانم اس دن ترکی وضع کے کپڑے پہنے تھی۔ پائوں میں آسماں رنگ کا شانی مخل اور پوست آہوگ کی نکے دار شیرازی جوتیاں، بہت پتلی ایڑی اور لمبی دوڑ، دیوار بالکل نہ تھی ایڑیاں کھلی ہوئی تھیں۔ جوتیوں کی نوکیں بھی شکر خورے کی چونچ کی طرح بہت لمبی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سرے پر جنگلی مرغے کے سرخ بیر بہوٹی جیسے پر کے طرے تھے، جوتیوں کے حاشیوں پر باریک بیل تھی جس میں سفید اور سنہرے پکھراج ٹکے ہوئے تھے۔ آدمی جوتیوں کی چھب دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔"(9)

ناول میں داستانی رنگ بھی ہے مثلاً"کتاب" عنوان کے تحت ص ۴۵ سے ۵۴ تک یہ باب ڈاکٹر وسیم جعفری کی تحریرات پر مبنی ہے۔ ایک بھیگی ہوئی کتاب وسیم جعفر کے بستر پر اپنے آپ بند ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی خفیہ ہاتھ اسے وہاں لا کر رکھ گیا ہو۔ یہ کتاب اپنے آپ کھل جاتی اور کبھی اپنے آپ بند ہو جاتی تھی۔ انھیں لگتا تھا کہ کوئی پیچھے سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا ہے لیکن دراصل کوئی ہے نہیں۔ وہ کیا کہتا ہے اس کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ یہ واقعہ دس صفحات میں بالکل داستانی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مہاراول کی آمد کے منظر میں بھی کچھ کچھ داستانی رنگ جھلکتا ہے۔ ناول میں جابجا فارسی اور اردو کے اشعار بہت برمحل اور برجستہ آئے ہیں۔ مرزا غالب، پھر ذوق، مومن حکیم احسن اللہ خاں، امام بخش صہبائی، داغ دہلوی اور مرزا فتح الملک بہادر کے ذکر کے ساتھ فارسی اور اردو کے اشعار جابجا تحریر کیے گئے ہیں۔ ان اشعار نے ناول کی ادبی فضا کو اور بھی نفیس ولطیف کر دیا ہے۔

اس ناول میں ایسی بے شمار جزئیات اور تفاصیل ہیں جو کہ قارئین کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ اس لیے کہ ان تفصیلات سے شمس الرحمٰن فارقی کی گہری معلومات اور واقفیت کا پتا چلتا ہے جو ان کے یہاں متعلقہ صورتحال کے حقیقت پسندانہ اظہار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس کی ساتویں

دہائی تک نوابوں کا رہن سہن، ان کے لباس کی تراش خراش، تہذیبی رکھ رکھاؤ، مشاعروں کی محفل میں شعرا حضرات کا احترام، انواع و اقسام کے کھانے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر رسوم و راج، نوابوں کی نگرانی میں کام کرنے والی ملازمائوں اور ان کی نوجوان لڑکیوں کے رویے، نوابوں کی ان پر عنایات، بے نکاحی خواتین یعنی کنیزوں کے ساتھ ان کا طرز عمل، ان کی بہادری وہیکڑی، انگریزوں کی زندگی، ان کے فاسقانہ خیالات اور نو آبادیاتی طرز عمل اس دور کے معروف خیالات عامہ جس کے تحت خواتین کو بغیر نکاح کے رکھنے پر معاشرے کے کانوں پر جوں کا نہ رینگنا، ایسے افراد کی بہتات جو نوابوں اور جاگیرداروں کو اس امر کی اطلاح دیتے تھے کہ فلاں فلاں خاتون کنواری ہے۔ لہذا ان سے یا ان کے ولیوں سے رابطہ کرنا تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے گھروں کی زینت بن جائیں۔ خود بادشاہ وقت کے صاحبزادے مرزا فخرو کو کہیں سے اطلاع ملی کہ وزیر خانم نام کی حسین و جمیل، عالم وفاضل، شاعرانہ مزاج کی حامل بیوہ دلی میں موجود ہے جس سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ مرزا تراب علی کی انتہائی افسوسناک موت اور ان کی بہنوں کے خراب سلوک اور شاہ آغا کو ہتھیانے کے امکان کے پس منظر میں داغ کی اٹھتی ہوئی جوانی اور ان کے بہتر مستقبل کے پیش نظر وزیر خانم کا یہ دلیرانہ فیصلہ قابل تعریف ہی گردانا جائے گا۔ پھر دلی کے شاہی قلعے کے ماحول میں اس کے شروع سے چلے آرہے ایمبیشن کے پھر سے توانا ہونے کا بھی امکان تھا۔ شمس الرحمٰن نے قلعے کے اندرونی ماحول کا بھی قابل تعریف نقشہ کھینچا ہے اور شاید ہی کوئی تفصیل تشنہ چھوڑی ہو۔ یہاں تک کہ اس دور میں پانی کی سپلائی کے ایک نئے نظام تک کا تذکرہ ہے جو خود کار طریقے سے اوپر کی منزلوں میں آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی قلعے کا کلچر ایسا تھا جس سے قاری نابلد تھا۔ مثال کے طور پر بادشاہ کے سامنے مخصوص اوقات میں شہزادگان اور ان کی بیگمات کا پیش ہونا، ان کی ان کے لیے شفقت، کئی مسائل یا امور پر مشورے اور فیصلے۔۔۔ ان تمام جزئیات کی عکاسی سے ناول میں وہ تمام عہد زندہ ہو گیا۔ اور ایک فلم کی طرح قاری کے ذہن کے پردے پر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی گھریلو اشیا کے مخصوص ناموں اور مروجہ اصلاحات کی نشاندہی جو کہ اب متروک ہیں۔ ان کے لیے جمالیاتی اور مطالعاتی مسرت کا سبب بنتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے اس عہد کے بارے میں دستاویزات کے تحت بہت مطالعہ کیا ہے تب کہیں جاکر اپنے اس فکشن کے "مرقع" میں سمویا ہے۔ کچھ کتب کی نشاندہی تو انھوں نے خود آخر میں کی ہے۔

وزیر خانم کے الم انگیز انجام کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فخرو سے اس کی شادی بہت خوش قسمتی کا باعث بنی کہ انھوں نے نہ صرف اس سے محبت کی اور شوہر کا پیار دیا بلکہ داغ اور شاہ کی

آغا کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر بھی کماحقہ دھیان دیا۔ لیکن چونکہ المیہ کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر چل رہا تھا اور اس کی تقدیر اس پر زندگی کے ڈرامے کے آخری ایکٹ کو اختتام تک پہنچانے کے لیے بیتاب تھی تو یہ ہوا کہ مرزا فخرو بیماری کے باعث چل بسے۔ وہ سمجھی کہ اب بقیہ زندگی قلعے میں بیوگی میں گزار پائے گی مگر املکہ نے اسے وہاں سے انتہائی توہین انداز میں رخصت ہونے پر مجبور کر دیا۔ وزیر خانم جو گفتگو کی ملکہ تھی اور اپنے دلائل سے اب تک اپنے ہر مخالف کو ہراتی آئی تھی، لاچار ہو گئی۔ جب اسے کوچ کا حکم ملا تو کوچ کا منظر بھی الم انگیز ہے:

"اگلے دن مغرب کے بعد قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البت اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید مرزا۔۔۔پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر کو جھکائے بیٹھی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا"۔(10) ۱۰

یہ ناول چونکہ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اس لیے کے بارے میں ابھی فکشن کے چند ہی اہم ناقدین کی تحریریں سامنے آئی ہیں۔ انتظار حسین اس ناول کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"مدتوں بعد ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچادی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو 'امراؤ جان ادا' نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی؟ اور یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے اول اول ہم نقاد اور محقق کی حثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرا حمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے اور محقق فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق وتنقید اور تخلیق کا کوئی ساتھ نہیں۔ لیکن زیر نظر ناول کو اس بات کی جسے قاعدہ کلی کے طور پر دیکھا گیا ہے، استثنائی صورت سمجھنا چاہیے۔ یہاں ہم تاریخ کو تخلیقی طور پر فکشن کے روپ میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔"(11)

لہذا کئی چاند تھے سر آسماں کچھ الگ طرح کا ناول ہے بے شک یہ تاریخ کے ایک عہد کے عالمانہ مطالعے کی پیداوار ہے۔ ناول میں صرف ایک کردار ایسا ہے جو حقیقی اور تاریخی ہے لیکن جس کے بارے میں ہم صرف دھندلے طور پر کچھ جانتے تھے۔ یہ کردار وزیر خانم نامی خاتون کا ہے۔ شمس الرا حمٰن فاروقی کی کردار نگاری کے طفیل وہ اب جاکر اپنے پورے رنگ وآہنگ کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ شمس الرا حمٰن فاروقی نے وزیر خانم کی زندگی کو اس درجہ لطافت، نزاکت اور باریک جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری تہذیب جسے ہندو مسلم تہذیب کہیے اور اس کے آخری دنوں میں اس کی چمک دمک

اور برگ وبار کا پورا نقشہ آجاتا ہے اور وزیر خانم کا کردار بھی کیا کردار ہے کہ وہ تنہا اپنی ذات ہی میں اس تہذیب کا مجسم وجود معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ انتظار حسین کو اس ناول اور امراؤ جان ادا کی ہلچل میں کوئی مماثلت نظر آئی ہو کیونکہ کوئی بھی غیر معمولی چیز غیر متوقع طور پر سامنے آتی ہے تو ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ناول کی ہلچل ایک نئی تخلیقی زبان کی ہلچل ہے اور وزیر خانم کی کردار سازی کی ہلچل ہے اور یہ ہلچل اردو ناول کی تاریخ میں نئے انداز کے تہذیبی فکشن کی بنیاد ڈالنے کی ہلچل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک وجہ یہ بھی ہو کہ شمس الرحمٰن فاروقی اس دور کے بڑے ناقد ہیں اور اب تک کسی بڑے ناقد نے کوئی بڑا ناول تحریر نہیں کیا۔ فاروقی صاحب سے بھی کسی تنقیدی مجموعے کی توقع اردو والوں کو تھی لیکن غیر متوقع طور پر ایسا ناول سامنے آگیا۔ بے شک اس ناول میں اتنے محاسن ہیں کہ اس پر ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس ناول کی بدولت نواب مرزا خان داغ دہلوی کی زندگی پر جو پردے پڑے ہوئے تھے وہ بھی فکشن کے توسط سے اٹھا دیے گئے ہیں اور اب ان کو صحیح تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ ناول انیسویں صدی سے بہت پہلے سے شروع ہو کر سال 1856ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس پورے عرصے کا بیان ہمیں ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جو معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے بے حد معمور ہے۔ یہاں کی زندگی اور اس کی اقدار نہایت مستحکم اور توانا ہیں۔ ہر طرف زندگی کی چہل پہل اور تحریک نظر آتا ہے۔ یہ دنیا اسی ہے جس پر کوئی بھی عہد فخر کر سکتا ہے۔ یہاں کی ادبی تہذیب بھی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور دنیا کی دوسری بڑی تہذیبوں سے خود کو کم نہیں سمجھتی۔ لیکن پھر زمانے کی بساط الٹتی ہے اور سماں بدل جاتا ہے ناول کے پورے پس منظر میں اس کا عنوان "کئی چاند تھے سر آسماں" جو احمد مشتاق کے درج ذیل شعر سے ماخوذ ہے، اپنی معنی خیزی نمایاں کرتا ہے کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمہاری زلف سیاہ تھی ناول کے خاتمے کے فوراً بعد قدیم انگریزی شاعر اور فکشن (مطبوعہ 1764) کی تین سطریں) اردو (The Traveller کی مشہور نظم "مسافر" 1728-1774 Oliver(Goldsmith نگار ترجمہ) بطور اختتامیہ درج ہیں جو حسب ذیل ہیں: میری جوانی کے دن دربدری میں گئے اور فکر الم میں نہ تھمنے والے قدموں کے ساتھ کسی خیر گریز پا کے تعاقب پر مجبور وہ جو اپنی جھلک دکھا دکھا کر میرا منہ چڑاتا رہتا ہے ان سطور سے معنی و مفہوم کے جو پہلو نکلتے ہیں وہ درج بالا شعر اور عنوان "کئی چاند تھے سر آسماں" سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔ اور یہ سب مل کر ناول کے تناظر کو زمان و مکاں کے وسیع امکانات سے

وابستہ کر دیتے ہیں۔اس طرح یہ ناول خارجی واقعات کا بیان محض نہ ہو کر ہمارے ادبی و تہذیبی حافظے کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

جہاں تک ایک خاص عہد کی تاریخ و تہذیب کو موضوع بنانے کا معاملہ ہے تو ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ عہد ہمارے شعور و احساس کے کسی ان دیکھے گوشے میں اب بھی موجود ہے۔ہم اپنے تہذیبی ماضی سے آج بھی اسی طرح وابستہ ہیں جس طرح ہمارے اسلاف اپنے تہذیبی ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔یہ ایسا تسلسل ہے جو ہر عہد میں قائم رہتا ہے،خواہ خارجی سطح پر صورت حال کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو جائے۔آخر کیا وجہ ہے کہ سوا سو برس گزر جانے کے بعد بھی "آب حیات" کی شہرت، مقبولیت اور ادبی اہمیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی ہے۔محمد حسین آزاد نے اس کتاب میں ہمارے ادبی و تہذیبی ماضی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اس قدر زندہ اور متحرک ہے کہ ہم جب بھی اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو خود کو ایک نئی دنیا میں پاتے ہیں۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو "کئی چاند تھے سر آسماں" کو ایک معنی میں "جدید آب حیات" بھی کہا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔شمس الرحمان فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۷، ص ۳۹

۲۔ایضا، ص ۱۳۹

۳۔سید، ارشاد حیدر،۔"کئی چاند تھے سر آسماں" ذھن جدید، ۲۰۰۷، ص ۳۷

۴۔شمس الرحمان فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۷، ص ۶۷

۵۔ایضا، ص ۲۸۶

۶۔ایضا، ص ۲۰۸

۷۔ایضا، ص ۱۰۷، ۱۰۸

۸۔ایضا، ۳۰۵

۹۔ایضا، ص ۸۲۲

۱۰۔ایضاً، ۳۰۵

۱۱۔سید ارشاد حیدر، کئی چاند تھے سر آسماں، ص ۹۷